یادوں کی دنیا

ایک تنقیدی مطالعہ

محمود احمد غازی

یوپی کے قصبات فرخ آباد اور ان کے نواح میں بنگش اور روہیلہ پٹھانوں کی ایک کثیر تعداد اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ سے آباد چلی آ رہی ہے۔ مغلیہ حکومت کے دور زوال میں ان اصحاب نے برصغیر کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نسلاً افغان اور مسلکاً حنفی ہونے کی وجہ سے یہ لوگ ہمیشہ برصغیر میں ہر اس تحریک میں پیش پیش رہے ہیں جس کا مقصد برصغیر میں اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ کا احیاء ہو۔ شاہ ولی اللہ، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید بریلوی وغیرہ اکابر کو اسی علاقہ سے معاونین حاصل ہوئے۔

انہی پٹھانوں میں کوہاٹ کے ایک بزرگ حسین علی خان تھے جو مدہ آخون یعنی استاد اکبر کے نام سے معروف تھے۔ حسین علی خان ۱۷۱۵ء کے قریب قائم گنج آکر آباد ہوئے جو ان کی آمد سے دو ایک سال قبل ہی نواب محمد خان بنگش نے اپنے لڑکے قائم خان کے نام پر قائم کیا تھا۔ آخون صاحب کی اولاد نے آگے چل کر بنگشوں اور روہیلوں کی قدیم روایت کو زندہ کیا۔ ان کے پڑپوتے مولوی فدا حسین خان کے زمانہ سے اس خاندان نے انگریزی علوم میں نام پیدا کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ۱۸۹۰ء میں حیدر آباد دکن میں وکالت کا آغاز کیا اور بہت جلد حیدر آباد اور پھر سارے ہندوستان میں بطور قانون دان ان کی شہرت پھیل گئی۔ آئین دکن کے نام سے اُردو زبان میں پہلا قانونی رسالہ انہوں نے جاری کیا۔ قانون کے مختلف موضوعات پر انہوں نے بیس سے زائد کتابیں لکھیں۔ یہی مولوی فدا حسین خان تھے جن کے تین صاحبزادے دنیائے علم و سیاست کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو علمی اور سیاسی مناصب کو طے کرتے ہوئے آخر میں بھارت

کے صدر بن کر شہرت و مقبولیت کی آخری بلندیوں پر پہنچے۔ ان کے منجھلے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خان بطور ایک ادیب، بالغ نظر نقاد، صاحب بصیرت مفکر و مورخ کی حیثیت سے ہندوستان و پاکستان کے علمی حلقوں میں مشہور و معروف ہوئے۔

زیر نظر کتاب "یادوں کی دنیا" (اعظم گڑھ، ۱۹۶۷ء) ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ان کی زندگی کی کم و بیش ساٹھ سال کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ یہ مشاہدات نہ صرف برصغیر کی تاریخ کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں بلکہ اس میں مسلمانوں کی تعلیم، مغربی تہذیب و تمدن، فرانس کا نظام تعلیم، اردو ہندی تنازعہ اور اس جیسے کئی دوسرے اہم مسائل تفصیل سے زیر بحث آگئے ہیں۔ ابتدائی دو ابواب میں مصنف کے خاندان کے بارے میں بڑی دلچسپ اور تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ بنگش خانزادہ نوابان کے مورث اعلیٰ نواب محمد خان بنگش کی شخصیت و کردار کا بھی اچھا ذکر آگیا ہے (ص ۱۲ - ۱۶) تیسرے باب میں مصنف نے اپنے سات بھائیوں کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ افسوس کہ ان سات بھائیوں میں سے چار نوجوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ اپنے ایک جوان مرگ بھائی عابد حسین خان کے بارے میں مصنف نے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی رائے نقل کی ہے۔ خلیفہ صاحب جو اُن کے ہم جماعت رہ چکے تھے کہا کرتے تھے کہ میں نے ایسے ذہین لوگ اپنی زندگی میں کم دیکھے ہیں (ص ۲۹ - ۴۰)

یوپی اور بہار کی قدیم ہندی۔ اسلامی تہذیب جس کو اکثر و بیشتر تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کے نمونے اور جھلکیاں بھی جستہ جستہ کتاب میں نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ (ص ۵۶ - ۵۷) انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ان کی والدہ محترمہ محلہ کی بعض غریب خواتین کی خفیہ خفیہ مدد کیا کرتی تھیں، انہوں نے اپنی اولاد کی فاضلانہ اور اعلیٰ تربیت کس طرح کی۔

کتاب کا چوتھا باب، فخر خاندان، ڈاکٹر ذاکر حسین خان پر مشتمل ہے۔ مصنف نے باب کا عنوان فخر خاندان رکھ کر زیادہ تواضع سے کام لیا ہے۔ واقعہ ہے یہ کہ ذاکر حسین اپنے علم، اپنے خلوص اور اپنے کردار کی وجہ سے (سیاسی اختلافات کے باوجود) فخر ہندوستان تھے۔ یہ پورا باب بیش بہا معلومات اور قیمتی نکات سے پُر ہے جامعہ ملیہ کا قیام، شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا خطبۂ صدارت، مولانا محمد علی جوہر کا خلوص اور روادارنگی، طلبۂ جامعہ کا دینی ذوق اور جذبۂ حکیم

اجمل خان کی خدمات اور اس طرح کے کئی اور موضوعات سے اس باب میں بحث کی گئی ہے۔ برلن میں ذاکر صاحب کے قیام کے دوران وہ کس طرح وہاں کے ارباب علم وفکر سے متاثر ہوئے اس کا بھی اچھا تذکرہ ہے۔ جامعہ کو چلانے میں موصوف نے جو خدمات انجام دیں ان کی بھی تفصیل اس میں آگئی ہے اس باب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں بنیادی تعلیم، فلسفۂ تعلیم اور مقاصد تعلیم پر ذاکر صاحب کے خیالات سے بحث کی گئی ہے۔ ذاکر صاحب کانگریس کی مقرر کردہ بنیادی تعلیم کی کمیٹی کے صدر تھے۔ اگرچہ ان کے تعلیمی نظریات سے کلی اتفاق کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اب تک ان کے تعلیمی نظریات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا یا کم از کم پیش نہیں کیا گیا، ڈاکٹر یوسف حسین خان نے بڑا اچھا کیا کہ ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات پر تفصیلی بحث کی اور ان کی اپنی تحریروں اور تقریروں کے طویل اقتباسات دیکر قاری کے لئے ایک مربوط اور جامع تصور پیش کر دیا ہے جن سے کئی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ علم وفضل کے اس قدر بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود دین و مذہب اور قومیت سے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین کے خیالات میں بعض جگہ بے ربطی بلکہ تضاد سا محسوس ہوتا ہے، (مثلاً ص ۱۱۱، ۱۱۲ وغیرہ پر ہندی قومیت اور اسلام کے تعلق پر بحث)۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے گورنر بہار اور نائب صدر ہند کی حیثیتوں میں جس اعلیٰ کردار، بلند اخلاق اور تواضع کا مظاہرہ کیا اس پر بھی آگے چل کر مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔ اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ ملیہ نے مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خان جیسے اکابر و فاضل کی سرپرستی اور رہنمائی میں جو لوگ تیار کئے تھے انہوں نے کس طرح اپنے اساتذہ کی توقعات کو پورا کیا پھر خود جامعہ ملیہ کی انہوں نے جس انداز اور لگن سے خدمت کی اس سے ان کی نیک نفسی اور خلوص کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جامعہ سے وہ بائیس سال وابستہ رہے اور ہر طرح کے مالی اور سیاسی نشیب و فراز کے باوجود انہوں نے جامعہ سے تعلق توڑنا گوارا نہ کیا، اس دوران ان کو عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری بھی پیش کی گئی (ص ۱۵۱) لیکن انہوں نے اس کو قبول نہ کیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین نے خود بھی جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ تقریباً پانچ سال جامعہ میں رہے (ص ۱۹۵)۔ اس دوران انہوں نے جامعہ میں کیا دیکھا، کس کو کیسا پایا، کیا پڑھا اور کیا سیکھا، یہ

سب تفصیل کتاب کے پانچویں باب "جامعہ کی زندگی" میں دی گئی ہے اس باب کا سب سے دلچسپ اور معلومات افزا حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے جامعہ کے اساتذہ کا تعارف کرایا ہے۔ خاص طور پر مولانا محمد سورتی اور مولانا اسلم جیراجپوری کے حالات بڑے دلچسپ ہیں۔ لیکن شاید اپنے اساتذہ میں وہ سب سے زیادہ متاثر تاریخ اور سیاسیات کے پروفیسر کیلاٹ صاحب سے ہوئے جن کا ذکر انہوں نے آٹھ دس صفحات میں کیا ہے۔ اس باب میں جامعہ ملیہ کے نصاب تعلیم، وہاں کے طریقۂ تدریس اور کانگریس کی تحریکات میں طلبۂ جامعہ کی شرکت پر بھی خاصی معلومات ملتی ہیں۔ اس باب میں اقبال سے ملاقات کے زیر عنوان مصنف نے علامہ اقبال سے اپنے دلی تعلق اور اس کے آغاز کا بھی ذکر کیا ہے، جب وہ جامعہ میں داخل ہوئے تو اُن کو بانگ درا پوری حفظ تھی (ص ۱۹۳) دوسری فارسی تصانیف کے بھی کافی حصے ان کو یاد تھے۔ ان کو اور ان کے چھوٹے بھائی محمود حسین خان مرحوم کو اقبال سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ان دونوں نے خاص طور پر اقبال سے ملاقات کے لئے لاہور کا سفر کیا اور زیارت اقبال سے شادکام ہوئے۔ اس ملاقات میں اقبال بار بار مولانا محمد علی کا ذکر کرتے رہے، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مولانا محمد علی کی خواہش تھی کہ اقبال جامعہ کی صدارت قبول کر لیں لیکن وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے معذور رہے (ص ۱۹۴) اقبال سے ان کی دوسری ملاقات ۱۹۲۷ء میں دوبارہ ہوئی، اس موقعہ پر ان کی مفکر اسلام سے تفصیلی ملاقات رہی، اب اُن میں اس قدر پختگی آگئی تھی کہ وہ اقبال سے استفادہ کر سکیں (ص ۱۹۴)، اس ملاقات میں ڈاکٹر یوسف حسین نے محسوس کیا کہ اقبال ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے بے حد متفکر ہیں، وہ کہتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی علیحدہ مملکت نہ ہوگی ان کا دین و تمدن خطرہ میں رہے گا (ص ۱۹۴ - ۱۹۵) ان ملاقاتوں سے یوسف حسین خان کو اقبال سے جو عقیدت تھی اس میں اضافہ ہوگیا (ص ۱۹۵)۔

اسی باب میں مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے جامعہ کے کتب خانہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا وہ نسخہ بھی دیکھا جو مولانا محمد علی جوہر کے تصرف میں رہ چکا تھا۔ اس پر مولانا کے قلم سے طویل حواشی بھی تھے، خاص طور پر جہاں کسی مقالہ نگار نے اسلام کے خلاف کوئی بات لکھی تھی وہاں مولانا کے قلم میں بڑی روانی اور جوش محسوس ہوتا تھا (ص ۱۹۶) یوسف حسین خان نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان حواشی و تاثرات کو اگر کوئی علیحدہ کر کے شائع کر دے تو ایک اچھی خاصی

کتاب نکل آئے گی۔

چھٹا باب دیار فرنگ مصنف کے قیام فرانس اور وہاں ان کی تعلیم کے تاثرات و مشاہدات پر مشتمل ہے۔ فرانس کی خواتین، فرانسیسیوں کے تہوار، فرانسیسی خاندان، سوربون یونیورسٹی، سوربون اور فرانس میں ارتقائے تعلیم کی تاریخ، پیرس شہر، پیرس کے اہل علم، فرانسیسی تہذیب، فرانسیسی ادب اور اس جیسے بہت سے اہم اور دلچسپ موضوعات پر مصنف نے ایک ادیب اور نقاد کی حیثیت سے گفتگو کی ہے۔ ان کو اٹلی جرمنی اور سوئٹزر لینڈ بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ پیرس میں قیام کے دوران ان کو ہندوستان کے متعدد اصحاب کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی، سجاد ظہیر وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۲۸ء میں اپنے سفر یورپ کے دوران یوسف حسین ہی کے پاس پیرس میں قیام کیا۔ اس قیام کا ذکر خود مولانا نے اپنے سفرنامہ میں (جو دراصل خطوط کا مجموعہ ہے) کیا ہے۔ مولانا کے قیام پیرس کی خاصی تفصیل اس باب میں دی گئی ہے۔ مولانا کی بذلہ سنجی، ظرافت اور طنز و مزاح کے بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دینداری اور خلوص کے لئے اشک بار چہروں اور خشک اور بے رونق صورتوں کا ہونا ضروری نہیں ہے، مولانا کے ہاں بیک وقت یہ دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔

مغربی تہذیب کے عام تاثر پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے ایک بہت پتے کی بات جس سے ان کی بالغ نظری کا خوب اندازہ ہوتا ہے، یہ کہی ہے کہ مشرقی ممالک میں پارلیمانی نظام حکومت اس شکل و صورت میں قائم نہیں رہ سکے گا جو انگلستان میں ہے۔ دنیا کی کوئی قوم تاریخی عمل کو یک بیک ظہور میں نہیں لا سکتی، اس میں قومی احوال کے لحاظ سے تصرف پذیری لازمی ہے۔ تاریخ کی اسی دھوپ چھاؤں میں قومیں اپنی تقدیر بناتی اور بگاڑتی ہیں"۔ (ص ۲۰۶)

۱۹۳۰ء میں یوسف حسین فرانس سے واپس ہوئے، ہندوستان میں ان کو حیدرآباد میں مستقل قیام کرنے اور وہاں اپنی باقاعدہ علمی زندگی کے آغاز کرنے کا موقعہ ملا۔ ساتویں باب میں انہوں نے قیام حیدرآباد کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں مرحوم حیدرآباد کی علمی زندگی، سرکاری نظام کی علمی و ادبی سرپرستی و حوصلہ افزائی کے علاوہ حیدرآباد کی لازوال یادگار جامعہ عثمانیہ اور وہاں کے ارباب علم و دانش کا تفصیلی تذکرہ بھی موجود ہے سابق شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا بھی ذکر ہے۔

جوشؔ اس زمانہ میں وہاں ناظر ادبی تھے اور ان کا کام یہ تھا کہ ترجموں پر ادبی لحاظ سے ایک نظر ڈالیں اُن کے اصلاح کردہ اور نظر ثانی شدہ بعض ترجمے مزید فنی نظر ثانی کے لئے یوسف حسین کو دیئے گئے تو پتہ چلا کہ جوشؔ صاحب نے ان پر محض اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تھی۔ بعض جگہ چالیس پچاس صفحوں تک سوائے ایک آدھ نشان کے کچھ نہ تھا (ص ۳۱۳)۔ دوسرے اصحاب علم کو بھی جوشؔ صاحب یہ شکایت تھی کہ وہ محنت سے اپنا فرض ادا نہیں کرتے (ص ۳۱۲)۔

جوشؔ صاحب کے سلسلہ میں دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ "وہ اقبال کو بڑا شاعر ماننے سے انکار کرتے تھے اور میں (یوسف حسین) اسے اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوشؔ صاحب کو غالباً یہ بات ناگوار تھی کہ لوگ اقبال کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں یہ حق تو ان کا ہے۔ میں اسے ان کی سادہ لوحی پر محمول کرتا ہوں"۔ ص (۳۱۳)

عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلق سے اس باب میں سب سے زیادہ تفصیلی تذکرہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا ہے جن کو یوسف حسین عثمانیہ یونیورسٹی کا اصل مؤسس قرار دیتے ہیں (ص ۳۱۴) اُردو زبان کے فروغ کے سلسلہ میں مولوی صاحب نے پچاس برس تک جو خدمات انجام دیں اُن کا خاصا تذکرہ بلکہ جھلک اس باب میں ملتی ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق شیعہ حضرات کے بارے میں خاصے متشدد خیالات رکھتے تھے۔ محمود احمد عباسی نے بھی اس مفروضہ کو خوب آگے بڑھایا۔ لیکن یوسف حسین نے اپنے طویل ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اس خیال کی تردید کی ہے (ص ۳۲۶-۳۲۸)۔ جوشؔ بلگرامی صاحب نے اس بارے میں عبدالحق کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، یوسف حسین نے اس کی تردید کی ہے۔

یہ کیونکر ممکن تھا کہ یوسف حسین سا ادیب و نقاد اور نکتہ رس برسوں حیدرآباد میں رہے اور ایلورا اور اجنتا کے شہرۂ آفاق آرٹ اور تصاویر کو نہ دیکھے۔ انہوں نے بارہا آرٹ کے یہ نادر اور تاریخی نمونے دیکھے کتاب کے کئی صفحات میں انہوں نے ان تصاویر کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان میں سے اکثر تصاویر برہنگی اور عریانی کا شاہکار ہیں، جبکہ ان کو بنانے والے فنکار وہ بدھ بھکشو ہیں جو لذاتِ نفس سے جان چھڑانے کے لئے ترکِ دنیا کر چکے تھے اس تضاد کی وجہ یوسف حسین کے الفاظ میں "یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں اور جب کبھی رہبانیت اختیار کی گئی تو اس کا یہی

ردعمل ہوا ..... نسوانی غمزہ و ادا کی کوئی صورت ایسی نہیں جو ان تصویروں میں موجود نہ ہو۔ جنسی لذت اندوزی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے فن کاروں نے نمایاں نہ کیا ہو۔ یہ اُس تعلیم کا ردعمل تھا جو تجرد اور رہبانیت سکھاتی تھی۔ اس طرح وہ مذہبی فلسفہ جو زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے زندگی اس کے ماننے والوں سے انتقام لیتی ہے۔" (ص ۲۳۴۔۲۳۵)

حیدرآباد کی دوسری ادبی اور علمی شخصیات میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، آغا حیدر حسن، مسز سروجنی نائیڈو، شاہزادی در شاہوار، سر اکبر حیدری، ان کی بیگم، نواب سالار جنگ، مہدی نواز جنگ اور کئی دوسرے اصحاب کا اچھا اور دلچسپ تعارف کرایا گیا ہے۔ آخر میں حیدرآباد کی آخری دور کی تاریخ اور سقوطِ حیدرآباد کے المناک واقعات کا بھی ذکر ہے۔ حیدرآباد کے واقعات خاصے معلومات افزا ہیں۔ انجمن اتحاد المسلمین کے آخری اور دیو مالائی شہرت کے مالک صدر قاسم رضوی مرحوم کے کردار کے بارے میں خاصی متضاد باتیں کہی جاتی رہیں یوسف حسین کو ان تمام واقعات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر المیہ حیدرآباد کی ذمہ داری وہاں کے ناتجربہ کار سیاستدانوں پر ڈالی ہے جن میں وزیراعظم میر لائق علی اور سید قاسم رضوی مرحوم وغیرہ بھی شامل ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے "جو عملی سیاست کا وسیع تجربہ رکھتے تھے قطعی طور پر کہا تھا کہ حیدرآباد کو ایک سال کے لئے معاہدۂ (انتظام جاریہ) کو قبول کرلینا چاہیے (ص ۳۹۲) لیکن میر لائق علی نے اس مشورہ کو نہ مانا۔ دوسری طرف قاسم رضوی نے بعض ایسی اشتعال انگیز تقریریں کیں جن کی بنا پر حکومت ہند کی خفگی بجا طور پر بڑھ گئی" (ص ۳۹۳) پھر اتحاد المسلمین کی قیادت نے کمیونسٹ پارٹی سے اتحاد کرکے یہ سمجھا کہ اب سارے ریاستی عوام اس کے ساتھ ہیں یہ ایک ایسی سخت غلطی تھی جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا (ص ۳۹۴)

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں "حیدرآباد کی قیادت اور وزارت کی غلطی یہ تھی کہ اس نے ان انقلابی حالات کا ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جو انگریزوں کے ہندوستان سے جانے اور ملک میں جمہوری اور پارلیمانی نظام حکومت قائم ہونے سے ظہور میں آئے" (ص ۴۰۵) اگر حیدرآباد کی قیادت ذرا دوربینی کا مظاہرہ کرتی تو شاید ہزاروں بے گناہوں کے خون کی ارزانی دیکھنے میں نہ آتی۔

حیدرآباد سے متعلق اس باب کے آخر میں مصنف نے بعض ان دانشوروں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اُن کو قیام حیدرآباد کے دوران ملنے کا موقع ملا۔ ان میں مشہور مترجم قرآن پکتھال، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، خواجہ غلام السیدین، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، مرزا اصغر گونڈوی اور قاضی عبدالغفار قابل ذکر ہیں۔ بالخصوص حسرت جگر اور فانی جیسے ادیبوں و شاعروں کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔

آٹھواں اور آخری باب علی گڑھ سے متعلق ہے جہاں مصنف نے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء تک بطور پرو وائس چانسلر کام کیا۔ اس باب میں آزادی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات و مسائل کا گہرا اور فاضلانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی کے معاملات کی جو تحقیقاتی کمیٹی بنی تھی اس کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں طلبہ نے جو نامناسب اور شرمناک ہلڑ بازی کی اور جس طرح تجربہ کار، معمر اور قابل احترام اساتذہ کو زدو کوب کیا اس کی دلخراش داستان بھی موجود ہے خود ڈاکٹر یوسف حسین خان اور پروفیسر خلیق احمد نظامی شدید زخمی ہوئے مسلم یونیورسٹی کے اس سات سالہ قیام کے دوران مصنف کو بھارت میں آزادی کے بعد اسلامی تعلیم و ثقافت کی بقا اور مستقبل پر بھی غور کرنے کا یقیناً موقعہ ملا ہوگا، انھوں نے ان موضوعات سے متعلق کئی مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے۔

یہ ہے اس کتاب کے مباحث کی ایک سرسری سی جھلک۔ پوری کتاب اس قدر دلچسپ اور معلومات افزا ہے کہ ایک بار شروع کرنے کے بعد ممکن نہیں کہ قاری ختم کئے بغیر اس کو چھوڑ دے۔ مصنف جابجا گھومے پھرے ہیں، ملک اور شہر شہر کے تجربات و مشاہدات سامنے آتے ہیں اہل علم و ادب کا تذکرہ ہے، مصنف کو برصغیر کے بڑے بڑے ارباب سیاست کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، ان کے بارے میں تاثرات ملتے ہیں۔ سیاسی تحریکات کے بارے میں بطور ایک عالم اور ادیب ان کا رد عمل کیا ہوا یہ بھی پتہ چلتا ہے جابجا حب الوطنی کے اعلیٰ جذبات چھلکتے ہیں۔ ہر واقعہ اور مشاہدہ سے سبق لینے کا جو ملکہ اللہ نے ان کو عطا کیا ہے اس میں قاری کو بھی شریک کر لیتے ہیں، پھر ان کی بے پایاں علمی تلاش کا جذبہ ہے جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے۔ پیرس کی حسین شامیں ہوں یا حیدرآباد دکن میں اجنتا کی تصویریں وہ ہر موقعہ پر علمی نتائج

اخذ کرنے سے نہیں چوکتے۔ ایک اور دلچسپ چیز مصنف کے طبی تجربات ہیں جو جا بجا نظر آتے ہیں (مثلاً ۲۶، ۶۷، ۱۵۰) غرض پوری کتاب نظیری کا یہ مشہور مصرعہ گنگناتی محسوس ہوتی ہے کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔

پھر زبان کی شستگی، محاوروں اور انداز بیان کی بندش اور چستی تو ایسی چیزیں ہیں جو روح اقبال اور اُردو غزل کے مصنف کے ہاں جتنی بھی ہوں ان کا حق ہے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ غرور و تعلی سے پاک صاف انداز تحریر قاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتا۔ پوری کتاب میں کہیں کوئی ادعا نہیں، کوئی بڑائی نہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ لکھنے والا وہ شخص ہے جس کی ہر کتاب میں اپنے موضوع کی انتہائی کتابوں میں سے ہے۔ نہ صرف کتاب میں بلکہ شاید مصنف اپنی عام زندگی میں بھی تواضع کے اس قدر معیار پہ عمل پیرا ہیں (ص ۴۲۹، ۴۳۱)

پوری کتاب میں کہیں بھی کوئی اختلافی بحث نہیں چھیڑی گئی۔ کسی سیاسی، یا نظریاتی مخالف کے خلاف کچھ نہیں لکھا گیا۔ مصنف ایک ایسے مفکر اور سیاسی لیڈر کے بھائی ہیں جن کے سیاسی اور تعلیمی نظریات سے بہتوں کو اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن انہوں نے اول تو ان معاملات کو چھیڑا نہیں، اگر کہیں کوئی اشارہ کیا بھی ہے تو نہایت عمدہ پیرائیہ بیان میں جس سے کسی کی کوئی دل آزاری نہیں ہوتی۔

لیکن افسوس ہے کہ ان خوبیوں کی حامل یہ کتاب طباعت کے اس معیار پہ چھپی ہے جس سے کم کسی معیار کا شاید بیسویں صدی کے ربع آخر میں تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے اس کی وجہ ناشرین کی زبردست مالی مجبوریاں ہوں۔ لیکن یہ کتاب اس کی مستحق تھی کہ اس کو طباعت کے اعلیٰ ترین معیار پہ چھاپا جاتا۔ افسوس ہے کہ ایسے ادارے جن کا کام محض فکری پراگندگی پیدا کرنا رہ گیا ہے ان کو وسائل کی فراوانی حاصل ہے اور دارالمصنفین اعظم گڑھ جیسا تاریخ ساز ادارہ شاید اس لئے مالی مشکلات کا شکار ہے کہ وہ ہندوستان میں اسلامی علوم اسلامی تہذیب، اُردو زبان اور اُردو ادب کی مقدور بھر خدمت کر رہا ہے۔

****